تدوین، ترتیب، تحشیہ و تعارف
ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

ایک نادر مکالماتی مصاحبہ

(انتظار حسین سلیم احمد سے)

Intizar Hussain and Saleem Ahmad were the most thoughtful Urdu literary figures of Pakistan. This article is based on the interview of Saleem Ahmad to Intizar Hussain. Both of these two prominent figures of Urdu literary panorama enjoy the status of stalwart of creative Urdu literature and criticism.

Interview throws light on the biographical and intellectual journey of saleem Ahmd, his main foundations of poetical and critic activity throughout the half century.

This interview is not a technical based construction, but a "masahiba" discovering all foundational emotional and hearty nuances of creative internity of Saleem ahmad's creative self as well as Intizar Hussain.

ہمارے قارئین آئے دن مصاحبے (انٹرویوز) پڑھتے ہی رہتے ہیں- کسی سیاستدان، کسی مذہبی عالم، کسی بڑے ناول نگار، کسی شاعر کسی نقاد کا مصاحبہ جو کوئی صحافی یا سیاست و ادب کا کوئی عام قاری اپنی دلچسپی کی کسی شخصیت سے کرتا ہے- لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنے میدان کا کوئی شہسوار جب اپنے ہی جیسے کسی شہوار سے مصاحبہ کرتا ہے تو اس کا کچھ رنگ ہی دگر ہوتا ہے- آئندہ صفحات میں آنے والا مصاحبہ، جو اصل میں دو بڑے ایبوں کے ما بین ایک مکالمہ ہے کچھ ایسی ہی اسباب کی بنا پر ایک الگ قسم کا مصاحبہ ہے-

دو ادیب، جن میں سے ایک اپنے زمانے کا بڑا اور طرح دار افسانہ و ناول نگار اور بیسویں صدی کے بڑے نثر نویسوں میں سے ایک تھا اور دوسرا اپنے زمانے کا ایک منفرد شاعر اور انتہائی مختلف اسلوب کا نقاد- دونوں نوعمری کے زمانے کے دوست- دونوں نے ۱۹۴۸ء میں ہندستان سے ایک ساتھ پاکستان ہجرت کی- ان میں سے ایک نے لاہور کو اپنا مسکن بنایا اور دوسرے نے کراچی جا بسرام کیا- شاعر نے وہاں شاعری اور خصوصاً غزل میں ایک طرحِ نو کی بنیاد رکھی--- وہی غزل جسے آگے چل کر اینٹی غزل بھی کہا

گیا---- اور تنقید میں ایسا ڈرامائی اور چونکا دینے والا اسلوب اختیار کیا جو اسی پر ختم ہو گیا۔ میرٹھ کی منڈلی کا افسانے نگار بھی آنے کو تو پاکستان آ گیا تھا مگر اپنا بچپن اپنی بستی میں ہی چھوڑ آیا۔ اس بستی کی یادیں تا دمِ مرگ اس کے دل سے نہ نکلیں۔ ان یادوں کے سہارے اس نے نے ماضی اور حال کو یکجان کر دیا۔

اس تمہید سے ہمارے قارئین سمجھ گئے ہونگے کہ اس افسانہ نگار سے ہماری مراد انتظار حسین اور شاعر اور نقاد سے مراد سلیم احمد ہیں۔ آئندہ صفحات میں آنے والا مصاحبہ اسی لیے ایک الگ انداز کا مصاحبہ ہے کہ یہ اپنے وقت کے ایک بڑے افسانہ نگار، انتظار حسین، نے ایک اہم شاعر اور نقاد، سلیم احمد، سے کیا ہے۔ یہ مصاحبہ کراچی میں ہوا اور اس کا کا اہتمام اور اسے ریکارڈ کرنے والے برصغیر پاک و ہند میں اپنی نوعیت کا منفرد شوق رکھنے والے جناب لطف اللہ خان تھے جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہم مشاہیر کی آوازوں کو محفوظ کرنے کا ایک نادر کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اس سلسلے میں لطف اللہ خان نے دو مصاحبوں کا اہتمام کیا تھا۔ ایک مصاحبہ انتظار حسین نے سلیم احمد سے کیا تھا اور دوسرا سلیم احمد نے انتظار حسین سے کیا تھا۔

اس سلسلے کا ایک مصاحبہ جو انتظار حسین نے سلیم احمد سے ان کے انتقال سے صرف دو اڑھائی ماہ پہلے، جون ۱۹۸۳ء، میں کیا تھا وہ آئندہ صفحات میں پیش ہے۔ دوسرا مصاحبہ ہم بعد میں پیش کریں گے۔ اس مصاحبے کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ یہ اڑتیس برس بعد پہلی مرتبہ اب معیار کے قارئین کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔ لطف اللہ خان کے آواز خزانے سے یہ مصاحبہ ہمیں صوتی ریکارڈنگ کی صورت میں ڈاکٹر محمد خورشید عبداللہ کی توسط سے ملا ہے۔

اس مصاحبے میں جو مسائل زیر بحث ہیں اور اس گفتگو میں جن جگہوں اور معاملات کا ذکر آیا ہے چونکہ وہ ان دونوں پرانے دوستوں کی مشترک یادوں کا حصہ ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سلیم احمد کے انتقال پر انتظار حسین نے "ادھوری تصویریں" کے عنوان سے جو مختصر سے تاثرات لکھے تھے(جن کا ہم سابقہ سطور میں ذکر بھی کر چکے ہیں) وہ یہاں نقل کردیے جائیں تاکہ ایک طرف تو ان دونوں دوستوں کے ماضی کے مشترک ورثے کے بارے میں آگاہی ہوجائے اور کچھاس مصاحبے میں آنے اشارات کا پس منظر بھی سامنے آجائے۔ علاوہ ازیں ہم کوشش کریں گے کہ سلیم احمد کے جوابات میں جو مسائل آئے ہیں بعد میں ان پر الگ سے بھی کچھ روشنی ڈال دی جائے۔ تو پہلے پیش ہے انتظار حسین کی "ادھوری تصویریں":

☆☆☆

"بہت کوشش سے کچھ دھندلی تصویریں ذہن میں ابھرتی ہیں- فی الحال وہی سہی-

پہلی تصویر- فیض عام انٹر کالج میں ایک ادبی شام- ایک کم عمر طالبعلم چپ چاپ سا بیٹھا ہے باری آنے پر شعر سناتا ہے- رنگِ اقبال میں رنگے ہوئے قطعات-

دوسری تصویر- وہی طالب علم خاکی کرتا پائجامہ، کاندھے پہ بیلچہ،چپ راست، چپ راست، چپ راست-

یہ تصویر بھی اپنا آگا پیچھا بتائے بغیر دھندلا جاتی ہے-

تیسری تصویر- بیلچہ غائب، خاکی کرتا پائجامہ ندارد، وہی عام سا سفید رتا پائجامہ، یاروں کی منڈلی جمی ہوئی ہے- لطیفہ بازی ہو رہی ہے- منڈلی میں کوئی شاعر، کوئی ہاکی کا کھلاڑی، کوئی قاری، میرا اس منڈلی میں کیسے گزر ہوا- اس نوخیز سے کہ نام سلیم احمد تخلص ہنؔر رکھتا ہے کیسے تعارف ہوا کیسے ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا- کچھ یاد نہیں آتا- میرا فیض عام سے کیا تعلق- میں میرٹھ کالج کی مخلوق ہوں مگر ایسی مخلوق جو کسی ٹکڑی کسی منڈلی میں شامل نہیں ہے- ہاں اب اس منڈلی سے مانوس ہوتا چلا جا رہا ہوں-

یہ تصویر بھی جلدی دھندلا جاتی ہے جو نئی تصویر ابھرتی ہے اس میں شاموں کا طور بدلا ہوا ہے اب شہر میں عسکری صاحب وارد ہو چکے ہیں ہم حیران ہو کر دیکھتے ہیں کہ اچھا یہ حر امجادی اور جھلکیاں والے محمد حسن عسکری ہیں- پھر ان کے قریب ہوتے چلے جاتے ہیں- تو اب شامیں عسکری صاحب کے لیے وقف ہیں- روز بلا ناغہ ان کے ہمراہ لمبی ٹہل ہوتی ہے- رفتہ رفتہ اس ٹہل کی ایک منزل ٹھہرتی ہے- کرار صاحب کا گھر جس کا مردانہ علامہ مشرقی سے بچھڑے ہوئے نوجوان خاکساروں کا مہمان خانہ بھی ہے- ہفت روزہ" الامین"، کا دفتر بھی، اردو میں ایم اے کرنے والوں کا کلاس روم بھی اور یاروں دوستوں کی بیٹھک بھی- تو روز شام کو ہم گھومتے پھرتے وہاں پہنچتے- لمبی بیٹھک کی- رات پڑے واپس-

اچانک روز و شب کا رنگ بدلتا ہے- قریب و دور سے فسادات کی خبریں آرہی ہیں- میرٹھ کی فضا کشیدہ ہوتی چلی جاتی ہے- گڑھ مکیٹشر کے سانحے کے رد عمل میں یہاں ابھی پچھلے دنوں ایک فساد بھی ہو چکا ہے- سو اب فضا میں بہت تناتنی ہے- دن تو خیریت سے گزرتا ہے مگر شام کے بعد کا کوئی اعتبار نہیں کہ کس وقت اکیلے دکیلے آدمی کے ساتھ کیا واردات گزر جائے- سو زندگی کا یہ طور ٹھہرا ہے کہ دن دن میں باہر کے سارے کاموں سے فراغت حاصل کی اور شام ہوتے ہوتے لپک جھپک اپنے اپنے گھروں کو واپس- پھر اپنے اپنے گھروں میں بند، اپنے اپنے محلے میں مقید- مسلمان کی مجال نہیں کہ شام

کے بعد ہندوئوں کے کسی بازار سے گزر جائے، کسی محلے میں قدم رکھے۔ ادھر ہندو کی ہمت نہیں کہ مسلمانوں کے محلے میں گزر کرے۔ مگر عسکری صاحب کے گھر کا انوکھا جغرافیہ ہے۔ ہندوئوں کا لمبا بازار۔ دائیں بائیں دکانوں کے عقب میں ہندو گھر۔ ایک نکڑ پر جا کر ایک گلی آتی ہے جس میں تین چار مسلمان گھر ہیں انہیں میں ایک گھر عسکری صاحب کا ہے۔ ہم بہت کوشش کرتے ہیں کہ شام سے پہلے اٹھ لیں۔ مگر کرار صاحب کی گفتگو ہمیں باندھے رکھتی ہے۔ تحصیل والی سڑک کے نکڑ پر پہنچتے پہنچتے رات ہو جاتی ہے۔ پھر عسکری صاحب اپنی راہ اور میں اور سلیم اپنی راہ کہ ہم خیر نگر سے ادھر گھنٹہ گھر کے پار اس علاقے میں رہتے ہیں جو خالصتاً مسلمان علاقہ ہے "یار سلیم، یہ راستہ تو بہت خطرناک ہے۔ کہیں اردو ادب کا نقصان نہ ہو جائے"۔ عسکری صاحب کو نکڑ پر چھوڑ کر واپس ہوتے ہوئے میں نے کہا۔

سلیم نے قہقہہ لگایا۔ "اردو ادب خطرے میں ہے"۔

رفتہ رفتہ ہم سنجیدہ ہوتے گئے۔ پھر ہم نے طے کیا کہ کل سے ہم عسکری صاحب کو انکے گھر تک چھوڑ کر آئیں گے۔

دوسرے دن ہم اپنے پروگرام پر عمل کرتے ہیں۔ بازار کے نکڑ پر پہنچ کرعسکری صاحب ہم سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہم ساتھ لگے چلے جا رہے ہیں۔ دکانیں تیزی سے بند ہوتی چلی رہی ہیں۔ لوگ کتنی تیزی میں ہیں۔ جب ہم واپس ہوتے ہیں تو پورا بازار بند ہو چکا ہے۔ سڑک اندھیر ہے۔ دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ ہاں ایک نکڑ پر اپنے پرانے ٹھکانے پر گول گپوں والا اپنا خوانچہ جمائے بیٹھا ہے۔ چند نوجوان گول گپے کھانے میں مصروف ہیں۔

"انتظار، گول گپے کھائیں"۔

"پاگل ہوئے ہو۔ بس چلے چلو"۔

سلیم میری ایک نہیں سنتا آگے بڑھ کر خوانچے کے پاس جا کھڑا ہوتا ہے۔اب ایک دونا اس کے ہاتھ میں ہے۔ ایک دونا میرے ہاتھ میں۔ سلیم گول گپے کھاتے کھاتے پھریری لیتا ہے اور لطیفہ سنانا شروع کر دیتا ہے۔ ارد گرد کھڑے گاہک تیز نظروں سے ہم دونوں کو دیکھتے ہیں۔

"یہ تم نے کیا حرکت کی"۔ وہاں سے آگے نکل کر میں نے باز پرس کی۔

"یار اب تو ہمیں روز ہی اس راستے سے گزرنا ہے میں نے سوچا کہ گربہ کشتن روز اول۔ پہلے ہی دن ہم ان پر جتا دیں کہ ہم ڈرنے والی مخلوق نہیں ہیں"۔

یہ تصویر بھی دھندلا جاتی ہے۔ اس کے ساتھ پورا میرٹھ میرے حافظے میں دھندلا جاتا ہے۔ اب جو تصویر

ابھرتی ہے اس میں میرٹھ کہیں نہیں ہے۔ سپیشل ٹرین دوڑی چلی جا رہی ہے۔ ہم مشرقی پنجاب سے گزر رہے ہیں۔ میں ہوں، سلیم ہے، سلیم کی منڈلی کے کچھ دانے، سلیم کے افرادِ خاندان، عسکری صاحب کے افراد خاندان، حسن مثنیٰ، صولت، رفعت۔ خوف ہمارا ہم سفر ہے۔۔۔

بعد کا سفر بالکل یاد نہیں آ رہا۔ بس اتنا یاد ہے کہ مغلپورہ سٹیشن پرپہنچ کر ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے تھے۔ ہٰذا فراق بینی و بینکم۔ پاکستان آگیا۔ میری اپنی راہ۔ سلیم کی اپنی راہ۔ میں لاہور میں۔ سلیم کراچی کی طرف۔۔۔

۔۔۔اصل میں اب سلیم کراچی میں رچ بس چکا ہے۔ منڈلی جمع ہو چکی ہے، ایسی منڈلی کہ میرٹھ کی منڈلی اس کے آگے کیا بیچتی ہے۔ اور اب ادب میں میری اور اس کی راہیں الگ ہیں۔ میں اس کے حساب سے لاہوریا بن چکا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اب تم لالو کھیت کے مفکر کہلانے کے حقدار ہو ادب میں میری جو روش ہے اس پر سلیم کو اعتراض ہے۔ سلیم پر جو سودا سوار ہوتا ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ لمبی طنز و تعریض کے بعد افہام و تفہیم۔ بس جیسے اب شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ مگر پھر اختلاف کا کوئی پہلو پیدا ہو جاتا ہے اور پھر وہی طنز و تعریض کا سلسلہ اور اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ وہ سلیم کے آخری ایام تھے جب مجھے حریت میں اس کے کالم پڑھ کر اندیشہ ہوا کہ کہیں میرا یار شعر و ادب تیاگ کر خالص مصلح نہ بن جائے۔ میں روک ٹوک کرنے کی ٹھانتا ہوں۔ مگر سلیم اس وقت بہت زوروں میں ہے۔ اپنے مصلحانہ جوش میں میری ایسی کی تیسی کر دیتا ہے۔ سلیم کو تو غصہ آگیا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اچھا تھوڑے دن چپ رہتے ہیں۔ اس کا دماغ ٹھنڈا ہوجائے پھر مزاج پوچھیں گے"

☆☆☆

انتظار حسین اور سلیم احمد کا باہمی تعلق، میرٹ کا تعلیمی ادبی و ثقافتی ماحول، سلیم احمد کا مزاج، ان کا ابتدائی شعری شعور، اٹھان و رجحان، ان کی ادبی تربیت میں پروفیسر کرار حسین اور محمد حسن عسکری کے اثرات اور ان دونوں اساتذہ سے ان کے تعلق کا ایک مکمل اور جاندار تذکر سابقہ سطور میں آگیا ہے۔ ان چیزوں کا یہاں مذکور ہونا اس لئے ضروری تھا کہ آئندہ سطور میں آنے والے مصاحبے میں ان میں سے کچھ باتوں کی طرف کہیں جلی اور کہیں خفی اشارے موجود ہیں۔

اس مصاحبے میں یوں تو ایسے بہت سے مسائل ہیں جن کی وضاحت ہونا روری ہے، ان میں سے کچھ کو ہم حواشی میں بھی کھولنے کی کوشش کریں گے مگر ایک دو مسئلے بطور خاص بہت اہم ہیں اور ان پر ہم اس تمہید میں کلام کرنا چاہتے ہیں۔

ان میں سے پہلا مسئلہ وہ ہے جو انتظار حسین کے سوال نمبر۲ کے جواب میں زیر بحث ہے۔ یعنی یہ بات

کی سلیم احمد نے شاعری کا آغاز تو اقبال کے انداز سے کیا مگر پھر فراق گورکھپوری کے رنگ میں غزل گوئی کرتے کرتے پاکستان میں آنے کے بعد وہ اس رنگِ غزل کی طرف کن حالات میں اور کیوں پلٹے جسے آج سے بیس تیس برس پہلے "اینٹی غزل" کہا جاتا تھا اور یہ کہ اس میں عسکری صاحب نے سلیم احمد کو جو مشورے دیے ان کی کیا معنویت ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے سلیم احمد کی غزلوں کا پہلا مجموعہ بیاض کے عنوان سے آیا تھا۔ اس کے بعد کے تینوں شعری مجموعوں ۔ اکائی، چراغ نیم شب اور مشرق کا شعری رنگ بیاض سے مختلف ہے۔ بیاض ہی کی غزلوں کا وہ رنگ ہے جیسے اس مصاحبے میں انتظار حسین نے ایک پہلو سے "تغزل دشمن" غزل کہا اور جو قیام پاکستان کے بعد ہماری تاریخ میں اینٹی غزل کہلائی۔ پاکستان میں اس طرح نو کی بِنا سلیم احمد نے ڈالی تھی۔ بعد میں اسی رنگ کو کسی حد تک گلافتاب میں ظفر اقبال نے بھی اختیار کیا تھا۔ جیسا کہ اس سوال کے جواب میں سلیم احمد نے بتایا ہے کہ انہوں نے اس طرحِ نو کا منصوبہ عسکری کے زیر اثر شروع کیا تھا۔ سلیم احمد نے حد درجہ اطاعت گزاری، سرافگندگی، نیازمندی اور جگر خون کردینے والی ریاضت کے ساتھ جس طرح عسکری کے ان مشوروں پر سال سال تک عمل کرکے دکھایا آج کوئی اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا!

انتظار حسین کے تیسرے سوال میں یہ استفسار ہوا ہے کہ آگے چل کر سلیم احمد جوں جوں فراق کی کیفیاتی شاعری کے اثر سے نکلے ہیں ان کی غزل میں "تعقلی رنگ" نمایاں ہوتا چلا گیا ہے۔ یہ ایک اعتبار سے سلیم احمد کا "اپنا" رنگ تھا جس میں ان کی تہذیبی فکر اور مذہبی خیالات کا بھی کچھ اثر تھا اور یہ تب پیدا ہوا جب انہوں نے عسکری کے "لکھنوی طرز" کے منصوبے پر مزید کام کرنے سے انکار کردیا۔ جس پر انہیں اپنے استاد کا عتاب بھی سہنا پڑا تھا۔ چونکہ یہ سارا عمل شعوری اور فعالی تھا اسی لیے انہوں نے وہ مشہور جملہ لکھا تھا کہ "شاعری شعور کی اولاد ہے"۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکائی کی زیادہ تر شاعری میں بیاض کا سا کیفیاتی رنگ مدھم اور نقاد سلیم احمد کا تہذیبی اضطراب و تعقلی رنگ غالب آگیا ہے۔ اسی کی انتظار حسین کو سلیم احمد سے شکایت بھی ہے۔

اس مصاحبے میں زیر بحث ایک اور مسئلہ بھی خاصی اہمیت کا ہے۔ سوال نمبر۷ میں انتظار حسین سلیم احمد سے کہتے ہیں کہ اب تم جس طرح کے ذہنی مشاغل میں میں پڑ گئے ہو اسے یوں لگتا ہے کہ ادب تمہارے لئے کچھ ضمنی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے اور تم کچھ "مفکراسلام" ٹائپ شے بنتے جارہے ہو! آگے چل کے اسی بات کا انتظار حسین ایک اور طرح سے استفسار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنے تنقیدی مضامین میں تو تم اپنے عہد اور پاکستان کی سیاسی و تہذیبی صورتحال سے بہت شغف رکھتے نظر آتے ہو لیکن جب تم شعر کہتے ہو تو تمہاری شاعری کا کوئی بہت زیادہ تعلق باہر کی ادبی دنیا سے نظر نہیں آتا کیوں؟ سلیم احمد نے اس کا جو جواب دیا وہ تو آپ مصاحبے میں پڑھیں گے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ

ادب کو اپنے تہذیبی سر چشموں سے جوڑ کر دیکھنے اور اپنے دور میں اس تصورِ ادب پر اثر انداز ہونے والے عوامل و اسباب کا مطالعہ کرنے والے کسی بھی "مفکر ادیب" کے لیے صرف ادب کے اندر بند رہنا تادیر ممکن نہیں رہتا۔

امید ہے کہ یہ چند تمہیدی کلمات اس مصاحبے کے کچھ مسائل کو سمجھنے میں ضرور معاون ثابت ہوں گے۔ آخر میں ہم چند باتیں اس مصاحبے کے ماخذ کے حوالے سے کر کے بات ختم کرتے ہیں۔ جیسا کہ مذکور ہوا یہ مصاحبہ لطف اللہ خان، کراچی کے آواز خزانے سے ہمیں محترم ڈاکٹر خورشید عبداللہ کے توسط سے حاصل ہوا ہے اردو دنیا میں مرحوم لطف اللہ خان اپنی گوناگوں تہذیبی دلچسپیوں کی بنا پراردو دنیا میں واحد آدمی تھے جنھوں نے اپنے آواز خزانے میں نایاب اردو آوازوں کا اور غنائی اصوات کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا کہ شاید دنیا میں کوئی انکا مقابلہ نہ تھا۔ لطف اللہ خان کے انتقال کے بعد بہت ممکن تھا کہ اتنا بڑا نادر اور نایاب ذخیرہ پردۂ گمنامی میں چھپ کر کلمعدوم ہوجاتا۔ مگر کراچی کی ایک منفرد شخصیت ڈاکٹر محمد خورشید عبداللہ، جو پیشے کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر ہیں مگر ادب اور علوم سے محبت کرنے والا ایک ایسا سخی دل لے کر پیدا ہوئے ہیں جو نہایت ہی کمیاب ہے۔ لطف اللہ خان کے انتقال کے بعد ان کی رسائی اس عظیم آواز خزانے تک ہوگئی تو انہوں نے اپنی فرصت کا ہر لمحہ اس کام کے لیے وقف کر دیا پرانے ٹیپس سے نکال کر ان میں کی کچھ منتخب چیزیں ڈیجیٹلائز کر ڈالیں۔ یہ مشقت بھری مہم سر کرتے ہوئے اب انہیں دو تین سال ہو چلے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے اب تک جو اصوات و آوازیں سوشل میڈیا پر آچکی ہیں ان کا تذکرہ ہم کسی اور موقع پر کریں گے۔ سردست اتنا عرض ہے کہ وہ اگر اس کام کو اپنی زندگی کا اہم ترین مقصد نہ بنا لیتے تو شاید آوازوں کا یہ خزانہ اتنی جلدی عام عوام تک نہ پہنچ پاتا۔ ہم ڈاکٹر خورشید عبداللہ صاحب کے ممنون ہے کہ انہوں نے اردو کے دو شہیر ادیبوں کے یہ دو مصاحبے ہمیں عنایت کیے اور ہم ان کی تدوین و ترتیب اور تحشیہ و تعارف کے بعد ان میں سے کا پہلا مصاحبہ معیار کے قارئین کے لئے پیش کرنے کے قابل ہو رہے ہیں۔ دعا ہے کہ مرحوم لطف اللہ خان کے درجات بلند رہیں اور ڈاکٹر خورشید اللہ کی توفیقات میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے۔

اس مصاحبے کو پڑھتے ہوئے قارئین محسوس کریں گے کہ سلیم احمد کی تخلیقی زندگی اور حسیت کے حوالے سے جتنا باریک بین مواد اس مکالمے میں آگیا وہ بہت نادر شے ہے۔ اپنے زمانے کے دو بڑے لکھنے والے یوں محو گفتگو تو اکثر ہوئے ہوں گے مگر یوں انہیں محفوظ کم کیا گیا ہوگا۔ یہاں یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ انتظار حسین نے سلیم احمد کے تخلیقی عمل اور تصورات پر اعتراضات، بصورت سوال، کرتے ہوئے پرانے تعلق کا بہت کم لحاظ کیا ہے اور سلیم احمد نے بھی چیں بر جبیں ہوئے بغیر کھل کر

جواب دیئے ہیں۔ اس مصاحبے کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس کے دو اڑھائی مہینے بعد ہی سلیم احمد کا انتقال ہوگیا تھا

قارئین کرام جانتے ہیں کہ دو بے تکلف گفتگو کرنے والوں کی باتوں کو ٹیپ سے تحریرمیں منتقل کرنا بظاہر مشکل کام نہیں لیکن در حقیقت یہ انتہائی صبر آزما م ہوتا ہے۔ لیکن مشکل تر مرحلہ وہ ہوتا ہے جب گفتگو کار لفظوں کو آگے پیچھے کر دے، کہیں سہواً کوئی ایسا لفظ اس کی زبان سے نکل جائے جو اس کی مراد نہ ہو، کہیں کہیں وہ جملہ ادھورا چھوڑ دے یا بیچ میں کوئی جملہ معترضہ کہنا شروع کر دے اور پھر بات وہیں سے جوڑ دے تو سامع کو تو اس کی مراد سمجھنا مشکل نہیں ہوتا مگر اسی بات کو اگر جوں کا توں تحریر میں منتقل کر دیا جائے تو پڑھنے والے کو اس کی تفہیم میں کچھ دقت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ان تمام امور کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم نے چند ایک مقام پر قوسین کا استعمال کرکے قائل کی مراد اس میں لکھنے کی کوشش کی ہے اور کہیں کہیں، برائے تقریب فہم، کچھ الفاظ کی ترتیب بھی آگے پیچھے کر دی ہے تاکہ مفہوم کی ترسیل میں آسانی ہو اور چند ایک مقام پر، جہاں کہنے والے نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا وہاں قوسین میں جملہ مکمل لکھ دیا گیا ہے۔ لیکن یقین رکھیے کہ ایسا صرف دو چار جگہوں پر ہی ہوا ہے۔ ورنہ بالعموم کوشش رہی ہے کہ انتظار حسین اور سلیم احمد کے اسلوب گفتگو کو بڑی حد تک اصل صورت ہی میں رکھا جائے۔

انتظار حسین: اچھا بھائی سلیم احمد اب میں میرٹھ ہی سے اپنی بات کا آغاز کرتا ہوں۔ جب میری پہلی تم سے ملاقات ہوئی ہے اور جب بعض دوستوں کے ذریعے سے، اُس وقت تم ''ہنرؔ'' تخلص کرتے تھے اور علامہ اقبال کے رنگ میں قطعات لکھ رہے تھے۔ اور ابھی دوستی کا آغاز ہی تھا کہ میں نے یہ دیکھا کہ علامہ اقبال کو تو تم نے رخصت کر دیا اور فراقؔ کے رنگ میں غزلیں کہنے لگے۔ اتنی جلدی یہ مرحلہ طے کیسے ہوگیا یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اور پھر فوراً میں نے یہ دیکھا کہ تمھاری خاکسار تحریک سے دلچسپی ہوگئی اور تم کرّار صاحب کے پاس پھیرے لگانے لگے ہو اور خاکسار تحریک کے باقاعدہ، یعنی، رکن بن گئے ہو اور کچھ رضاکار قسم کے نظر آ رہے ہو۔ تو فراق کے رنگ میں غزل ایک طرف، اور دوسری طرف خاکساریت۔ تو علامہ اقبال کی قطعات کے ساتھ تو شاید یہ بات نبھ جاتی لیکن فراقؔ کے رنگ کے غزل کے ساتھ یہ بات کیسے نبھ رہی تھی، یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم ذرا اس کی وضاحت کرو گے؟ تمھیں اس زمانے میں ہو کیا رہا تھا؟

سلیم احمد: ہاں بھائی ''ہنرؔ'' (تخلص) کا معاملہ یہ تھا کہ جب میں فیض عام[۱] میں آیا نویں جماعت میں، تو میں نے کہا کہ بھائی شاعر کا ایک تخلص ہونا چاہیے، اگر وہ شعر کہتا ہے تو۔ شعر میں نے پہلے سے کہنا شروع کر دیا تھا۔ تو میرے دادا کا تخلص تھا ''ہنرؔ''، سیّد عباس علی ہنرؔ، تو میں نے کہا کہ بھائی یہ جو تخلص اپنا خانہ ساز ہے اور اپنے دادا کا ہے، تو یہ میں اپنے نام کے ساتھ لگا لوں۔ چنانچہ میں نے ''ہنرؔ'' اپنے ساتھ (لگالیا)، چند مہینے وہ رہا۔ خاکسار تحریک کا معاملہ یہ تھا کہ میں لکھنؤ میں ایک

خاکساروں کا، جب وہاں مجلس صحابہ ''ایجی ٹیشن'' (Agetation) ہو رہا تھا، اس زمانے میں خاکساروں کا ایک وہاں وہ ہوا تھا، کیمپ لگا تھا۔ اس میں بڑے زبردست، گویا، انہوں نے اپنے مظاہرے کیے تھے اور اس سے میں بے انتہا متأثر ہوا تھا تو اسی زمانے سے میں نے ''الاصلاح'' اپنے نام جاری کروالیا تھا اور اس میں علامہ مشرقی کے مضامین پڑھا کرتا تھا۔ تو یہ دلچسپی میری میرٹھ آنے سے پہلے سے تھی۔ اب یہاں آیا تو جناب، کرّار حسین صاحب معلوم ہوا کہ خاکسار تحریک سے وابستہ ہیں۔ میرے دوست تھے نعیم مرحوم نعیم الدین صدیقی وہ مجھے کرار صاحب کے پاس لے گئے۔ تو میں نے کرّار صاحب سے کہا کہ صاحب، جو اس زمانے میں جو ایک انجمن تھی ''انجمنِ ادارہ ادبیہ'' اس میں آپ ایک مضمون پڑھ لیجیے تو کہنے لگے کہ ہاں پڑھ دوں گا۔ تو میں نے کہا صاحب موضوع بتا دیجیے تو انہوں نے کہا صاحب امرد پرستی میرا مضمون ہوگا۔ تو یہ کرّار صاحب سے ہمارا پہلا معاملہ ہوا۔ تو اس سے کرّار صاحب کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ یہ فراق صاحب جو تھے یہ عسکری صاحب نے میرے پیچھے لگائے۔ انہوں نے کیا کہ، تمہیں یاد ہوگا، میں علامہ اقبال کی رنگ کی نظمیں اور غزلیں لکھتا تھا، لیکن کچھ قطعات میں نے لکھے تھے جو میری ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے تھے تو انہوں نے میری جو بیاض مانگی مجھ سے تو انہوں نے علامہ اقبال وغیرہ کے رنگ کی ساری شاعری چھوڑ دی اور وہ قطعات منتخب کر لیے اور کہا کہ تم اس رنگ میں کیوں نہیں کہتے ہو؟ تو فراقؔ صاحب کی (کتاب) اردو کی عشقیہ شاعری آچکی تھی اور عسکری صاحب اس کے عظیم ترین مداحوں میں سے تھے، تو انہوں نے مجھے فراقؔ صاحب کے پیچھے لگا دیا۔ تو وہ فراقؔ صاحب اس طرح (آئے)۔ ویسے میں آج تک یہ سوچتا ہوں، انتظار حسین، کہ میری جو ذاتی زندگی ہے اس کا کوئی اظہار گویا وہ نوعیت میرے ہاں اختیار نہیں کر سکا جو میری ذہنی زندگی کا تھا۔ تو فراقؔ صاحب سے اور اس قسم کی شاعری سے میری دلچسپی جو ہے وہ میری ذاتی زندگی تک محدود ہے لیکن نظریاتی زندگی[۲] میری اُس سے الگ رہی۔

انتظار حسین: ہاں یہ تو اصل میں، اِس سلسلے میں، ایک سوال اور کرنے والا ہوں، لیکن پہلے تو ایک آدھ بات اِسی قسم کی اور ہو جائے۔ تم فراقؔ صاحب کے رنگ میں غزلیں لکھتے لکھتے پاکستان میں وارد ہوئے۔ میں تو لاہور میں رہ گیا، تم کراچی چلے گئے، عسکری صاحب بھی پھر کراچی آ گئے اور جو غزلیں تمہاری میں پڑھتا رہا وہ فراقؔ کا رنگ ہی تھا۔ شروع میں وہ غزلیں ہمیں بہت اچھی لگتی تھیں اور یکایک پھر ہم نے دیکھا کہ تمہاری شاعری میں دوسرا رنگ آ گیا اور وہ اس قسم کی غزل جسے کہ تغزل دشمن غزل کہنا چاہیے، تو بالکل ہی الٹ قسم کی، جو فراقؔ کے رنگ کے بالکل متضاد ایک رنگ تھا۔ یہ تبدیلی کس طریقے سے تمہارے یہاں آئی؟ اگرچہ اس کے اثرات پھر بعد کی ہماری غزل پر بہت پڑے ہیں اور اس قسم کی غزل جو ہے وہ ایک فیشن بن گئی لیکن غالباً آغاز اس رنگ کا تم سے ہوا تھا تو یہ خیال تمہیں، یہ تبدیلی کیسے آئی تمہارے یہاں؟

سلیم احمد: اب یہ قصہ یہ ہے کہ شاعری کا جو تم نے مسئلہ چھیڑا ہے تو اس میں (بات یہ ہے کہ) جب سے عسکری صاحب مجھے ملے اور انہوں نے مجھے فراقؔ صاحب پر لگایا۔ اُس وقت سے گویا یہ سمجھو کہ گویا میں نے اپنی ''ذاتی'' شاعری کرنی چھوڑ دی اور عسکری صاحب جو نمونے میرے سامنے رکھتے جاتے تھے کبھی حسرتؔ کا، کبھی حالیؔ کا، کبھی داغؔ کا، کبھی یہاں تک کہ سوداؔ

کا، اور مطلب یہ آتش کا اور لکھنوی شعرا کا، اسیر کا اور رند کا، وہ نمونے رکھتے جاتے تھے، کہتے تھے کہ صاحب یہ کرو اور وہ ایک عجیب بات کہا کرتے تھے جو اُس وقت میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں اُن سے کہتا تھا کہ صاحب شاعری تو ذاتی جذبات، ذاتی تجربے اور ذاتی زندگی کا اظہار ہے۔ وہ کہتے تھے کہ صاحب اس میں یہ آنے ہی نہ دو۔ تا آں وقتیکہ بعد میں میری سمجھ میں آیا کہ وہ دراصل کہنا یہ چاہتے تھے کہ جب تک اظہار کے تمام سانچوں پر اور تمام اسالیب پر تمہاری دسترس نہ ہوجائے اُس وقت تک گویا یہ کام (ذاتی تجربے کے اظہار والا) شروع نہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے یہ کیا کہ مجھے یہاں سے گویا شروع کیا اور پیچھے، پیچھے، پیچھے اور ہزاروں نمونوں در نمونوں تک لے گئے۔ ایک وقت ایسا آ گیا کہ جب انہوں نے کہا کہ سلیم احمد کو گویا غم کے اسالیب پر قابو ہو گیا ہے۔ تم تاثر پیدا کر لیتے ہو۔ تمہیں قافیہ لکھنا آ گیا ہے۔ تم شعر کو مزیدار بنا سکتے ہو۔ مگر غم و غصے اور طنز کے اسالیب پر تمہارا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ تو اب ذرا تم طنز اور غم و غصہ، اور ان کیفیات کو جو ہجویات سے قریب ہیں، اُن کو ذرا برت کے دکھاؤ۔ وہ میں نے کام شروع کیا تو وہ اُس سے وہ غزل جس کا تم اشارہ کر رہے ہو، تو وہ برآمد ہوگئی۔ تو وہ بھی گویا اسی طرح تجرباتی بنیاد پر اسلوب کا گویا تجربہ کرنے کے لیے وجود میں آئی۔ اور وہ ایک بات جو بعد میں اُن کے ایک مضمون کو پڑھنے سے سمجھ میں آئی وہ یہ تھی کہ وہ یہ کہتے تھے کہ شاعر اور ادیب کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ادب کو وہ دے جو صرف ہندوستان اُسے دے سکتا ہے۔ یعنی مشرق جو اُسے دے سکتا ہے۔ ہندوستان کے ساتھ چین کا لفظ بھی انہوں نے لکھا ہے کہ مشرق کیا دینا چاہتا ہے کہ اُس میں ہندوستان کیا دینا چاہتا ہے۔ اور ان کا خیال یہ تھا کہ یہ جتنی شاعری ہو رہی ہے یہ بلکہ یہ جتنا ادب لکھا جا رہا ہے یہ گویا مغرب کا ایک چربہ ہے جس کے اندر ہندوستان کی روح نہیں بولتی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ انہوں نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ ہندوستان کی روح کتنی بڑی ہے کہ میں اس کی نمائندگی کی ذمہ داری اُٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوں، اس لیے میرے کریکٹر جو ہیں ''اینگلو انڈین'' ہوتے ہیں (ہاں، جزیرے کے ''اختتامیہ''[۳] میں ہے۔۔۔ انتظار حسین)، گویا وہ تیار مجھے اس بات پر کر رہے تھے کہ ہندوستان کی روح کو میں سمجھوں اور اُس کو میں اپنی شاعری کا موضوع بناؤں۔ اس کے لیے دو چیزیں ضروری تھیں۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان میں اُردو کی شاعری کے جتنے قدیم اسالیب ہیں جو Discarded بھی ہو چکے تھے اور فرسودہ بھی ہو چکے تھے، اُن سب پر میری دسترس ہو۔ دوسرے تمام انسانی تجربات کے اظہار پر میری دسترس ہو اور جب یہ چیز ہو جائے تو میں اپنے تجربات کی اس نوعیت کو دریافت کروں جو انفعالی نہیں ہیں۔ انفعالی سے وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہر قسم کا تجربہ، ہر قسم کا خیال، ہر قسم کا احساس آپ کے ماحول میں آ رہا ہے۔ شعراء ادیب کیا کرتے ہیں کہ اس کے آگے سپر انداختہ ہو جاتے ہیں اور اس کو اپنے اندر داخل (کر لیتے ہیں)۔ اُس سے اُن کے اندر کوئی کشمکش، کوئی مزاحمت، کوئی پیکار پیدا نہیں ہوتی۔ یعنی اس کا فاعلی عمل اس پر نہیں ہوتا تو وہ یہ چاہتے تھے کہ یہ فاعلی عمل (ہونا چاہیے)۔ اس لیے اگر میں کوئی بھی شعر ایسا کہہ دیتا تھا جیسا کہ میرے ماحول میں ہو رہا ہے تو وہ کہتے تھے، یہ تو وہ کسی کا نام لیتے تھے کہ، یہ تو وہ بھی کر سکتا ہے۔ یہ تو فلاں بھی کہہ دیتا۔ سلیم احمد کا اس میں کیا ہوا۔ سلیم احمد سے وہ یہ کام لینا چاہ رہے تھے جیسا کہ میں نے کہا کہ وہ گویا مشرق یا ہندوستان کی نمائندگی جس طرح اردو میں ہو سکتی ہے۔

انتظار حسین: اب مجھے یہ پتہ نہیں کہ یہ، جسے میں کہتا ہوں کہ، تمہارے ساتھ جو سانحہ گزرا ہے، میری دانست میں، وہ عسکری صاحب کی صحبت کی وجہ سے گزرا یا خود تمہارے اندر کوئی ایسی بات تھی۔ شروع کا جو تمہارا زمانہ ہے، جس کا میں نے ذکر کیا کہ فراقؔ کے رنگ میں جب تم نے غزل کہنی شروع کی تو وہ ایک ایسی شاعری تم کر رہے تھے کہ جس میں تعقل کا کوئی زیادہ عمل دخل نہیں تھا۔ وہ تجربے کی شاعری تھی یعنی فراقؔ کی شاعری بھی اسی قسم کی ہے کہ جس میں تجربے پر زیادہ زور ہے اور تعقل اُن کے ہاں آتا بھی ہے تو ضمنی طور پر، جو پروفیسر کی حیثیت سے کبھی کبھی وہ شغل کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب تم اس اثر سے نکلے ہو، فراقؔ والی غزل کے اثر سے، اور وہ جو دوسری قسم کی غزل آئی تو تمہارے یہاں اب یہ نظر آتا ہے کہ یہ اس کی شاعری میں تعقل آ رہا ہے اور کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آ رہا ہے۔ اچھا اسی کے ساتھ تمہارے تنقیدی مضامین بھی آئے لیکن رفتہ رفتہ مجھے یہ احساس ہوا کہ مجرد تصورات سے تمہاری دلچسپی بڑھ رہی ہے اور وہ شاعری جو ہے، جسے شاعری کہتے ہیں، اس سے دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے تو وہی مجرد تصورات جو ہیں وہ شاعری میں بھی اپنا عمل دخل کرتے جا رہے ہیں تو مجھے یہ نظر آ رہا ہے کہ تم ہمارے لیے تو شاعر تھے۔ شاعر کے طور پر پیدا ہوئے تھے لیکن منزل ایک وہ آ گئی، جبکہ شاعر پیچھے رہ گیا اور تم نے مجرد تصورات سے اتنی شغف کا اظہار کیا کہ تم ایک عالم اور ایک مبلغ زیادہ نظر آنے لگے، اس کی ذرا تم مجھے یعنی (وجہ بتاؤ)۔[۴]

سلیم احمد: اس کی وجہ یہ تھی، جیسے میں نے انتظار بتایا تمہیں، کہ ایک تو میری دلچسپی جو مذہب سے تھی، اور مذہب سے دلچسپی بالآخر آدمی کو تعقل پر لے جاتی ہے اگر وہ صرف Emotion پر Based نہ ہو۔ میں مناظرے باز ہمیشہ کا تھا اور مناظرے باز، مناظرہ بازی اور اس قسم کے تصورات سے اور عقائد سے مجھے بڑی دلچسپی رہی۔

شاعری سے اس کا تعلق یہ بنتا ہے کہ، اور عسکری صاحب نے جو کام مجھ سے ینا چاہا، وہ base ہی شعور پہ کرتا تھا۔ مطلب یہ جس طرح ان کے اندر تجربے کی روایت ہوگئی، لیکن میں جب خارجی طور پر محسوس کرتا رہا، تو میں سمجھتا تھا کہ یہ عقلی کام ہے کہ مجھے رِندؔ کے رنگ کی یا اسیرؔ کے رنگ کو اپنے اندر جذب کرنا ہے اور اس کے بعد اس کو Reproduce کرنا ہے۔ تو یہ میں نے وہ لکھ دیا کہ، ایک فقرہ جو بعد میں بڑا دلچسپ بنا، کہ ''شاعری شعور کی اولاد ہے''۔ تو وہ قصہ ہوا۔ ایک کام میں یہی کر رہا تھا کہ شاعری، شعوری طور پر، آج میں سوداؔ کے رنگ میں کر رہا ہوں، کل میں اسیرؔ کے رنگ میں کر رہا ہوں۔ پرسوں حسرتؔ کے رنگ میں کر رہا ہوں۔ تو یہ گویا لسانی اور تجرباتی نوعیت تو یہ نہیں ہوتی۔ لیکن جب ایک وقت ایسا اس میں آ گیا جب میں نے عسکری صاحب سے کہہ دیا کہ اب یہ کام میں نہیں کروں گا۔ وہ جناب ناراض ہوگئے اور جب میں نے (اس طرح کی) غزلیں نہیں کہیں تو انہوں نے یہ کہا کہ سلیم احمد جو ہے، اب لونڈوں کو خوش کرنے کے لیے شعر کہہ رہا ہے اور ایک الزام انہوں نے یہ لگایا کہ جو کام وہ کر سکتا ہے، اس کے کرنے کے بجائے، وہ شہرت کے پیچھے پڑ گیا ہے اور جو کام انہوں نے کرایا ہے وہ بیاض میں اس کی سولہ سترہ غزلیں ہیں، اس کی انتظار، انہوں نے وہ highest تعریف کی کہ اگر وہ کسی اور شاعر کی تعریف کر دیں تو وہ شاعر شاید پاگل ہوجائے۔ انہوں نے یہ کہا کہ ''صاحب یہ کام وہ ہے کہ اگر فیضؔ

صاحب کرلیں تو ان کو فخر کرنا چاہیے‘‘۔ ناصر کاظمی کے بارے میں کہا کہ سلیم احمد کہ ’’دو شعر ناصر کاظمی کے دونوں مجموعوں پر بھاری ہیں‘‘۔ ایک روز جا رہے تھے اور مجھ سے غزل سنی، تو مطلب یہ ہے کہ، میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگے کہ ’’تجھے ہو کیا گیا ہے‘‘۔ میں نے کہا کہ عسکری صاحب، کیا بات ہے؟ کہنے لگے کہ ’’بھائی میں نے یہ پڑھا تھا کہ باغ و بہار جب امیر خسروؒ نے لکھی تو نظام الدین اولیاءؒ بیمار تھے۔ وہ انہوں نے سنائی تو انہوں نے کہا کہ میں شفایاب ہو گیا اور دُعا دی باغ و بہار کو یہ ہمیشہ باغ و بہار ہی ثابت ہو۔ (عسکری) کہنے لگے کہ میں نے پڑھا تو تھا لیکن مجھے اس پر یقین نہیں تھا۔ اب ذاتی تجربے سے مجھے اس پر یقین آ گیا ہے۔ ’’تیری غزلیں سن کر میں شفایاب ہو گیا، میں بیمار تھا‘‘۔ ایک روز کہنے لگے کہ ’’سلیم جو کام تم نے کیا ہے وہ کوئی اور تو کیا کرے گا میں بھی نہیں کر سکتا‘‘۔ میں نے کہا ’’صاحب آپ کیوں نہیں کر سکتے ہیں‘‘۔ آپ خود افسانہ نگار ہیں اور آپ تخلیقی کام اس میں کر سکتے ہیں۔ وہ کہنے لگے ’’افسانے میں اس لیے نہیں کر سکتا کہ افسانے کے پیچھے اتنی بڑی روایت نہیں ہے جتنی بڑی غزل کی روایت ہے‘‘۔ تو یہ اُن غزلوں کی یعنی انہوں نے یہ تعریفیں مجھ سے کیں اور ایک دفعہ میں نے اُن سے شکایت کی کہ صاحب یہ تو آپ نے مجھ سے لکھنؤ کے رنگ میں غزلیں کہلائیں۔ یہ لکھنؤ کیسا ہے کہ آلِ رضا تک مجھے داد نہیں دیتے۔ انہوں نے کہا بھائی آلِ رضا تو عزیز لکھنوی کے لکھنؤ کے ہیں۔ یہ آتش کے لکھنؤ کے تھوڑا ہی ہیں۔ ان کو کیا پتہ لکھنؤ کیا چیز ہے، تو یہ ان (عسکری) کا رویہ تھا۔ اس کے بعد جب میں نے یہ کہا[۵] تو وہ مجھ سے بیزار ہو گئے۔ وہ اب تم اکائی پر آؤ گے تو اس پر دیکھو گے کہ میں نے سابقہ رنگ سے کتنا (انحراف) کیا ہے۔

انتظار حسین: اچھا جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اور ادب کا تعلق ہے تو عسکری صاحب نے جو جو تمہیں راستے دکھائے تم اس پر چلے اور اُس پر تم نے بہت کمالات کیے جس سے اُنہوں نے تمہیں بہت داد دی بول کر لیکن ایک دوسرا شعبہ جو ہے اُس سے تمہاری جب دلچسپی بڑھی تو وہاں صورتحال کچھ مختلف ہو گئی۔ یعنی جب تمہاری دلچسپی اسلام سے زیادہ بڑھی اور تم نے اس قسم کا کام کیا کہ بھائی آج کا جو سیاق و سباق ہے، بالخصوص آج کے پاکستان کے جو سیاسی حالات ہیں، ان کے پس منظر میں اسلام کی تشریح و تفسیر، تو عسکری صاحب بھی اپنے طور پر یہ کام کر رہے تھے لیکن یہاں تمہارا راستہ، ایک ایسی سمت میں تم چلے گئے کہ عسکری صاحب منہ دیکھتے رہ گئے کہ بھائی یہ میرا شاگرد عزیز۔۔۔ میں کیا کہہ رہا ہوں، اور یہ اسلام کو کس طریقے سے سمجھ رہا ہے اور یہ اُن لوگوں کے پیچھے چلا گیا جن سے عسکری صاحب بہت یعنی خائف نظر آتے تھے اسلام کی تفسیر و تشریح کے سلسلے میں ایسا کیوں ہوا؟[۶]

سلیم احمد: ہاں! اچھا میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ عسکری صاحب جو تھے اُن لوگوں کے اُس وقت بھی مخالف تھے جب اُن کا کوئی تعلق مذہب سے نہیں تھا اور مذہبی ہونے کے بعد (بھی) مخالف رہے۔ میری زندگی کا یہ ایک المیہ ہے کہ عسکری صاحب کا انتقال جب ہوا تو ڈھائی سال سے ہماری اُن کی ملاقات بند ہو چکی تھی۔ اور اُن کے جو سیاسی رجحانات تھے اور میرے جو سیاسی رجحانات تھے، اُن میں ایک اتنا بڑا تضاد اور سیاہ و سفید کا فرق تھا کہ ہم کہیں مل نہیں سکتے تھے۔ لیکن میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں تو ان کو اپنا استاد بلکہ استاد سے بہت زیادہ ان کو سمجھتا تھا اور میں نے بقول، تمہارے، تم کہا کرتے تھے کہ

عسکری ایسے ہیں اور عسکری کے لفٹیننٹ سلیم احمد ایسے ہیں۔ تو میں نے یہ لکھا کہ میں انفرادیت کے نام پر بھی عسکری سے اختلاف نہیں کرتا اور جو جیسا وہ کہتے ہیں ویسا کرتا ہوں۔ مجھ سے انہوں نے یہ کہا کہ ''تم سیاسی مضامین لکھو۔ کیا تم لکھنے کے لیے تیار ہو؟'' میں نے کہا میں لکھنے کے لیے تیار ہوں۔ اچھا صاحب وہ کہنے لگے کہ فلاں رسالہ نکلتا ہے اس میں لکھنا۔ وہ رسالہ اخبار نہیں نکلا لیکن میں نے لکھنا شروع کر دیا تو عسکری صاحب نے مجھ سے شکایت کرنے کے بجائے دوسروں سے شکایت کی۔ یہاں تک کہ مظفر علی سید نے مجھ کو عسکری صاحب کی شکایت پہنچائی۔ کہا کہ وہ بہت ناراض ہیں اور بہت افسوس کر رہے تھے۔ میں نے کہا صاحب کہ دو مسئلے ہیں: یا تو وہ حکم دے دیں کہ یہ بند کر دو۔ میں آج ہی اس کو بند کر دوں گا اور زندگی بھر ادھر لوٹ کر نہیں آؤں گا یا مجھے قائل کر دیں، تو عسکری صاحب نے نہ حکم دیا نہ قائل کیا۔ ہا ہا ہا !! (دونوں طرف سے قہقہے بلند ہوتے ہیں)۔

انتظار حسین: اب میں ایک شخصیت کا اور ذکر کرتا ہوں کہ یہ عجیب بات ہے کہ ایک ایسی شخصیت تھی ہماری اور تمہاری دونوں کی زندگی میں جو شروع میں بہت ہمارے لیے Inspiration اور فیضان کا ذریعہ تھی لیکن میں یہ دیکھتا ہوں کہ اُسے بہت جلد وہ شخصیت تمہاری زندگی سے خارج ہو گئی مثلاً کرّار صاحب ہیں جو ہمارے مشترک استاد تھے اور اس وقت تمہیں بھی وہ بہت Inspire کرتے تھے اور مجھے بھی کر رہے تھے اور خاکسار تحریک میں جو تمہاری شمولیت تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کرار صاحب سے بہت قریب ہو گئے تھے اور ان کا بھی اسلام کو سمجھنے کا اور سمجھانے کا اپنا ایک اسلوب چلا آ رہا تھا۔ مگر عسکری صاحب تمہاری زندگی میں اِس طریقے سے آئے کہ کرار صاحب جو ہیں تمہاری زندگی سے الگ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ادب کے سلسلے میں بھی تم اُن سے کوئی فیضان حاصل کرتے نظر نہیں آتے۔ لیکن جب اسلام پر غور و فکر کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو تم عسکری صاحب سے انحراف کر کے جاتے ہو تو دوسرے مفسرین کی طرف، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی طرف چلے گئے۔ وہ کرار صاحب بیچ میں کہاں رہ گئے۔ وہ تمہاری زندگی سے۔۔۔

سلیم احمد: کرّار صاحب کا معاملہ یہ ہے کہ آج تک اگر میں کوئی تقریر کرتا ہوں کہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ کرار صاحب کی جوانی بول رہی ہے۔ یعنی مجھ پر اُن کے اتنے اثرات ہیں جذباتی طور پر اور وجدانی طور پر کہ میں سمجھتا ہوں کہ کرار صاحب جو ہیں وہ میرے اندازِ گفتگو تک میں کرار صاحب کی جھلک نظر آتی ہے۔ دیکھیے کرار صاحب سے یہ تعلق میرا عسکری صاحب کی وجہ سے کچھ گہن میں آ گیا۔ عسکری صاحب نے میرے دماغ کو اتنا متاثر کیا کہ اس میں میرا کرار حسین سے جو جذباتی تعلق تھا، وہ گویا دب گیا اور ایک وقت گویا ایسا آ گیا اب میں بزرگوں کی باتیں کہہ ہی دوں کہ ریکارڈ یہاں ہو رہا ہے، کہ دونوں اُستاد شاگرد بھی تھے، اور یوں تھا، لیکن اندر اُن دونوں کے ایک قسم کی۔۔۔ یعنی الگ طور پر عسکری صاحب مجھ سے کرار صاحب کے بارے میں جو بات کرتے تھے، یعنی سارے ادب و احترام کے باوجود، وہ ایسا ہوتا تھا کہ جس کو تنقید کہا جا سکتا ہے۔ اور کرار صاحب بھی مجھ سے الگ بات کرتے تھے تو عسکری کی Fear of women اور یہ ان کی Complexes ہیں (وغیرہ وغیرہ)۔ تو وہ ان چیزوں کا ذکر کرتے تھے۔ تو یہ کوئی کشمکش تھی۔۔۔! میں نے کرار صاحب

سے ایک دفعہ کہا تھا کہ صاحب، میرے سینے میں، لکھا ہے شاہ ولی اللہ نے، کہ صاحب میرے اندر علیؓ کی محبت گویا اتنی ہے کہ اگر میں اپنے دل کو آزاد چھوڑ دوں تو وہ اس طرح گویا علیؓ کی طرف پھرتا ہے جس طرح طائر اپنے آشیاں کی طرف یا اونٹنی کا بچہ اونٹنی کی طرف دوڑتا ہے۔ لیکن مجھے حکم ہے کہ میں ابوبکر صدیقؓ کی تعریف کروں۔ تو میں نے کہا کہ صاحب میرے معاملے میں یہ ہے کہ میرے سینے میں بھی عسکری اور کرار حسین کی کشمکش ہوتی رہتی ہے۔ ہا ہا ہا۔۔۔ (دونوں کا قہقہہ بلند ہوتا ہے)۔ اور آج تک میں اس کو Resolve نہیں کر سکا کہ وہ کس صورت میں تھی۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ عسکری صاحب کی موت کے بعد یہ کشمکش جو تھی یہ بہت حد تک دور ہوگئی۔ اب گویا میں دونوں کی چیز اپنے دل و دماغ میں بہت گہرائی سے محسوس کرتا ہوں۔

انتظار حسین: اچھا اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جیسے سب بزرگوں ہی سے تمہارے تعلقات رہے ہیں، تمہارے ہم عصر بھی تو ہوں گے۔ مثلاً میں، جب مجھ سے کوئی بات کرتا ہے تو میں اپنے استادوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ بھی کہتا ہوں کہ ناصر کاظمی میرا ایک ہمعصر تھا جس سے میں نے بڑے اثرات قبول کیے اور ہم نے بہت کچھ مل کر ادب میں کرنے کی کوشش کی۔ تو تمہارے کوئی ہمعصر ایسے بھی ہیں جن سے تمہیں، تمہارا کوئی رشتہ رہا ہو، جن کے ساتھ۔۔۔

سلیم احمد: نہیں انتظار، میرا المیہ یہ رہا ہے کہ ذاتی تعلق میرا تم سے بھی ہے، ناصر کاظمی سے بھی تھا، جمیل جالبی سے ہے، عالی سے، عزیز حامد مدنی سے، مجتبیٰ حسین سے ہے، یہ میرے بڑے جذباتی طور پر قریب اور بہت یعنی مجھ کو عزیز ہیں لیکن میرا ان سے تخلیقی تعلق کوئی نہیں ہے۔ تمہارا تخلیقی تعلق بنا ہے لوگوں سے لیکن میرا تخلیقی تعلق کسی آدمی سے نہیں بنا اور نہ میں سمجھتا ہوں کہ اُن میں سے کوئی آدمی ان مسائل سے کسی طرح بھی وابستہ رہا جو مسائل میرے ذہن کے اور جذبات کے بنے یا کسی سے میرا اشتراک رہا۔ میں عقلی طور پر بہت سی چیزیں تمہاری پسند کرتا ہوں، پڑھتا ہوں، بعض چیزوں میں تم سے بہت زیادہ قریب ہوں۔ مثلاً جب تم علامتوں کے زوال کی بات کرتے ہو اور نئے تصوف [۸] کی بات کرتے ہو اور گویا ماضی کے Dimention کی بات کرتے ہو تو بہت زیادہ، لیکن تم سے بھی میرا کوئی تخلیقی رشتہ نہیں بن سکا۔

انتظار حسین: تو کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تمہارے جس قسم کے ذہنی مشاغل تھے اور جو سفر تھا ذہنی تو اس میں ادب جو ہے ایک رستہ ہے، تم پہنچنا کہیں اور چاہتے تھے، مثلاً میں تو ادب ہی میں رہنا چاہتا ہوں، تم ادب سے آگے کہیں پہنچنا چاہتے ہو، تو وہ کیا ہے یعنی اس کی ذرا وضاحت کرو کہ اب تمہاری زندگی میں، ویسے تو تم اپنے ان مقامات تک پہنچ گئے ہو جہاں ادب جو ہے تمہارے لیے ضمنی حیثیت اختیار کر گیا ہے لیکن اب آج کی صورتحال کیا ہے کہ تم اپنی شاعری کو کتنی اہمیت دیتے ہو اور میرے متعلق کیا یعنی حکم ہے، یعنی تمہیں میں شاعر کے طور پر قبول کروں یا ایک مفکرِ اسلام کے طور پر؟ تو اس کی ذرا وضاحت ہو جائے۔

سلیم احمد: بھائی ابھی، ایک انٹرویو میں کسی نے کہا ''صاحب آپ کیا کرنا چاہ رہے ہیں؟'' تو میں نے کہا صاحب میں تین

کتابیں لکھنا چاہ رہا ہوں۔ ایک کتاب تو گویا تصوف پر بیسویں صدی کے نقطۂ نظر سے، اور ایک اُس چیز پر کہ جس کو کہتے ہیں ہندی مسلمانوں کا قومی تشخص یا تہذیبی تشخص، جس کو سمجھے بغیر ہم گویا اس قوم کے مسائل کو نہیں سمجھ سکتے اور تیسری کتاب گویا وہ تھی جو میں نے اقبال ایک شاعر میں نہیں لکھی، اور جس کو میں اقبال پر اپنی بات کو ختم کرنے کے لیے ایک اتمامِ حجت کے طور پر لکھنا چاہتا ہوں، تو اُن میں سے تینوں چیزوں میں میری شاعری منہا ہے، یعنی یہ تم دیکھو میری ذہنی ـ ـ ـ، ایک دفعہ میں نے تم کو لکھا تھا کہ انتظار حسین کہ میں کچھ فلسفہ پڑھوں۔ تم نے کہا تھا کہ ''خدا کے لیے کچھ رحم کرو فلسفے پر''۔ کیا تم انتظار، یہ سمجھ سکتے ہو کہ پچیس سال سے میں نے شاعری اور فکشن نہیں پڑھا، یعنی یوں رسالے میں کوئی دیکھ لیا ہو یا کسی کتاب پر تبصرہ کرنے کے لیے کچھ دیکھ لیا ہو لیکن میرا Interest اس سے کم سے کم تر ہوتا گیا۔

انتظار حسین: اچھا اس پر مجھے ایک بات یاد آ گئی کہ جب فکشن کا تم نے حوالہ دیا۔ جب تم میرٹھ میں تھے تو تم نے باقاعدہ کچھ افسانہ لکھنے کی کوشش کی اور ایک کہانی ایسی سنائی تھی جو میں آج بھی جب میں اس کا تصور کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ وہ بہت اچھی کہانی لکھی گئی تھی لیکن اُس کے بعد میں نے یہ دیکھا کہ تمہارا فکشن کی طرف کوئی رُجحان ہے ہی نہیں اور ادبی نقاد کی حیثیت سے بھی تم نے فکشن سے کوئی غرض رکھی ہی نہیں۔ شاعری پر گفتگو کرتے نظر آتے ہو تم۔ ساری اپنی ادبی تنقید میں یہ فکشن کا خانہ تمہارے یہاں سے کیوں یعنی خارج ہو گیا؟

سلیم احمد: بھائی میں، مطلب فکشن جو تھا اس قدر دلچسپی سے پڑھا تم کو وہ زمانہ یاد ہی ہے۔ میں نے داستانوں سے لے کر طلسم ہوشربا اور امیر حمزہ اور لال نامہ اور باختر نامہ، باون جلدیں باون دفاتر تھے، سارے پڑھے، اس کے بعد سرشار پڑھا، اس کے بعد سارا فکشن، یہ میں پڑھتا رہا۔ اب میں تاریخ مقرر کرتا ہوں کہ شاید منٹو کی موت کے بعد میں نے فکشن پڑھنا چھوڑ دیا۔ میرے ساتھ ایک معاملہ یہ تھا، پہلے تو میں رسالوں میں ہر ایک آدمی کو پڑھتا رہتا تھا، پھر وہ محدود ہوتا گیا۔ غزلیات کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ مطلب یہ کہ دو تین نام رہ گئے۔ اگر میں دیکھ لوں اُن کو پڑھ لیتا ہوں۔ یہی فکشن میں ہو گیا۔ تو وہ اتنا ہوتے ہوتے وہ اتنا محدود ہو گیا کہ اس سلسلے میں کوئی مطالعہ، کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تو میں اس پہ لکھتا کیا؟

انتظار حسین: اچھا مجھے لگتا ہے کہ جو حادثہ عسکری صاحب کے ساتھ گزرا وہی تمہارے ساتھ گزرا ہے، یعنی عسکری صاحب بھی چونکہ اُن منازل میں تھے کہ رفتہ رفتہ وہ اپنا جو عہد تھا، اُن کا ادبی عہد اس کے متعلق ان کا رویہ کچھ ایسا ہو گیا، تحقیر کا سا کہ اس زمانے میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ اور اس رویے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے عہد سے نکل ہی گئے اور وہ کچھ اور یعنی باہر کا ادب پڑھنے لگے اور پھر وہ اس کے بعد ادب ہی سے نکل گئے، تو تمہارا معاملہ بھی مجھے یوں نظر آتا ہے کہ جب یہ معیارات تم نے اپنے قائم کیے تھے کہ مجھے یہ پڑھنا چاہیے یا یہ نہیں پڑھنا چاہیے۔ پہلے تو تم عصری ادب پر تنقید لکھتے لکھتے، پھر تم اس عہد سے ہی نکل گئے۔ پھر تم نے کہا اب میں کیا پڑھوں، منٹو تو مر گیا ہے۔ اور شاعری میں کیا پڑھوں، بھائی اب کیا لکھا جا رہا ہے،

تو یہ جو تعلق جو ہے جو بھی برا بھلا ہمارے عہد میں لکھا جاتا ہے، اگر ہم اتنا اونچا معیار رکھ لیں تو پھر وہ اس عہد سے تعلق کسی نہ کسی طرح ختم ہو جاتا ہے۔

سلیم احمد: انتظار میں تم کو بتاؤں جو چیز مثلاً تم نے ناصر کاظمی کو محسوس کیا یا شعراء میں تم دیکھتے ہو ان کی رقابتیں ہوتی ہیں، ان کے مقابلے ہوتے ہیں، کہ بھائی فلاں شعر کہہ رہا ہے، فلاں کہہ رہا ہے یا میں کہہ رہا ہوں، وہ نہیں کہہ رہا ہے۔ مجھے کسی ہم عصر سے یہ محسوس ہی نہیں ہوا۔ نہ یہ محسوس ہوا، نہ رقابت کا نہ رفاقت کا احساس۔ تو یہ جو میرے چیز اندر پیدا ہو گئی، یہ عسکری صاحب کی وجہ سے کہو، یا کسی اور وجہ سے کہو، لیکن میرے اندر یہ چیز پیدا ہو گئی اور اس کا مجھ کو بہت بڑا نقصان گویا برداشت کرنا پڑا اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اب میں زیادہ قریب ہو کر اپنے ہم عصروں کو دیکھ رہا ہوں اور پڑھ رہا ہوں اور اُن سے کوئی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، لیکن بیس پچیس سال سے میرا یہ عالم رہا کہ میرا اُس سے کوئی تعلق کسی قسم کا باقی نہیں رہا۔

انتظار حسین: یہ تعلق تو تمہارا اس حیثیت میں بھی قائم رہنا چاہیے تھا کہ تم نے یعنی غزل کہنے کے ساتھ ساتھ ادبی تنقید میں بھی قدم رکھا اور یہ منازل تو بعد میں آئے ہیں جو اب تم نے مذہبی تصورات پر گفتگو شروع کی ہے اور سیاسی مضامین لکھے، لیکن شروع کا جو دور ہے تمہارا تو ایک بہت اچھے نقاد کی حیثیت سے تم نظر آتے ہو اور اس تنقید میں وہ مسائل نہیں ہیں جو آج کے ہیں، سیدھی، سچی، ادبی تنقید ہے وہ اس میں بھی تمہارے، اس کے واسطے بھی تمہارا اپنے عہد سے تعلق قائم تھا جب تم نئی نظم اور پورا آدمی لکھ رہے تھے یا اور مضامین، تو یہ ادبی تنقید سے بھی یعنی بے تعلقی تمہارے یہاں کیوں کس وجہ سے پیدا ہوئی؟

سلیم احمد: بھئی اس میں ایک بات جو تم کو بتا دینا ضروری ہے کہ میں نئی نظم اور پورا آدمی میں نے لکھا۔ وہ غزلیات لکھ رہا تھا، فلاں کر رہا تھا کہ اس میں ایک پیریڈ آیا، سن ۱۹۶۳ء میں کہ جب مجھے نروس بریک ڈاؤن ہوا۔ اس نروس بریک ڈاؤن کی میری زندگی میں بڑی زبردست اہمیت ہے کیونکہ وہ گویا ایک مذہبی دیوانگی کا مظہر تھا، یعنی وہ کیفیت یہ تھی، انتظار، کہ میں رات رات بھر نماز پڑھتا رہتا تھا اور قرآن کی تلاوت کرتا رہتا تھا اور پوری پوری رات گویا میں سجدے میں رہتا تھا، تو وہ سات دورے مجھ کو ہوئے۔ اُس نے میری شعور کی کیفیت کو اس طرح منقلب کر دیا کہ، مجھے مطلب یہ کہ، شعر و ادب سے میرا۔۔۔، یعنی یہ وہی وقت ہے جب میں سب سے زیادہ پُرجوش ہو کر شعر و ادب کے بارے میں لکھ رہا تھا، ۶۱ء میں نئی نظم پورا آدمی آئی ہے۔ یہ سن ۶۳ء کا ذکر ہے۔ اُس کے بعد سے یہ میرے اندر کیفیت بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ یہ عالم تھا کہ میں ٹہل ٹہل کر گویا یہ کہتا تھا اور خدا سے دعا مانگتا تھا کہ خدا اس کو کچھ کم کرے اور اپنے آپ سے کہتا تھا کہ صاحب کوئی میں Defender of Fath نہیں ہوں۔ میرا منصب یہ نہیں ہے کہ میں یہ کروں، یہ اپنے آپ کو سمجھاتا تھا۔ لیکن وہ کیفیت مجھ پر غالب، یعنی وہ مجھے یہاں تک لے گئی کہ میں نے، مطلب یہ کہ، یہ جو مولانا مودودی اور فلاں اور فلاں

کوایک اسلامی نشاۃِ ثانیہ "Renaissance" کی، وہ شاید خاکسار تحریک میں بھی اس کا بیج موجود تھا، تو وہ گویا وہ مجھ پر غالب رہی۔ لیکن اب میں ایک بیلنس اپنے اندر محسوس کر رہا ہوں اور میری ادبی دلچسپی پھر Revive ہو رہی ہے۔ گویا بیس پچیس سال یعنی تم کو (حیرت ہوگی کہ) میں نے کوئی مجموعہ شعری یا افسانوی نہیں پڑھا۔

انتظار حسین: تو اب کیا صورتحال ہے؟

سلیم احمد: اب پھر مجھ کو دلچسپی محسوس ہو رہی ہے۔

انتظار حسین: تو یہ جو ہمارے عہد میں ادب لکھا گیا ہے۔ تم دوبارہ اس میں یعنی رجوع کر رہے ہو، پڑھ رہے ہو؟

سلیم احمد: ہاں پڑھ رہا ہوں۔

انتظار حسین: اب یہ جو واپسی ہوئی ہے اور اب اس ادب کو دیکھ رہے ہو، اس کے بارے میں کیا تمہارا تاثر ہے؟

سلیم احمد: میرا تاثر یہ ہے کہ اس ادب میں، گویا، اس کی جو مختلف جہات رہی ہیں، اُس میں کچھ Dimentions کی تو کمی ہے، یعنی ان معنی میں کہ یہ پولیٹیکل اور سائکالوجیکل زیادہ رہا ہے، یعنی یا تو لوگ اپنے جذباتی اور نفسیاتی مسائل لکھتے رہے ہیں یا مطلب یہ کہ سیاسی چیزیں لکھتے رہے ہیں لیکن اس میں ایک Dimentions جو گویا میٹافیزیکل تجربے کی ہے۔ وہ اس میں سے معدوم ہے جس کی وجہ سے یہ تجربات میں گہرائی اور وہ معنویت اور وہ چیز پیدا نہیں ہوتی۔ چونکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ سات دورے میرے جو تھے اُن میں مجھے ایسے تجربات ہوئے ہیں کہ جو اس Dimention کو سمیٹتے ہیں۔ تو میں اُن کی تلاش میں ہوں کہ یہ کمی جو ہمارے ادب میں باوجود اس کے کہ بہت جاندار اور بہت اپنے عہد کو لیکن اس میں یہ۔۔۔۔ (جملہ نامکمل چھوڑ دیا سلیم احمد نے۔۔۔ مراد ہے کہ ''یہ کمی ہے۔۔!'')

انتظار حسین: اچھا میں اس سلسلے میں ایک بات یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ویسے جب شعر و ادب سے ہٹ کر جب تم اظہارِ خیال کرتے ہو تو یہ عہد جو ہے تمہارے لیے بہت بڑا مسئلہ نظر آتا ہے۔ پاکستان کی جو سیاسی صورتِ حال ہے، جو معاملات و مسائل ہیں اُن میں تمہارا بہت شغف نظر آتا ہے۔ اُس سیاق و سباق میں تم سوچتے ہو اور اظہارِ خیال کرتے ہو، لوگوں سے آپ کی لڑائیاں ہوتی ہیں لیکن جب تم شعر کہتے ہو تو اس قسم کا تعلق جو ہے اپنے عہد سے وہ کہیں نظر کم بہت کم نظر آتا ہے یعنی Action اور Reaction جو ہے نا اُس طریقے سے شاعری میں تمہارے یہاں نظر نہیں آتا جس طریقے سے مضامین میں ہے۔

سلیم احمد: ہاں، یہ بالکل ٹھیک ہے، سوائے ایک نظم ''مشرق''[۹] کے۔ ''مشرق'' میں تو میں اپنے ماحول سے بہت زیادہ وابستہ ہوں، وہ چونکہ چھپی نہیں ہے لہٰذا وہ میری پوری زندگی سے بہت (جڑی ہوئی ہے)، وہ جو میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ میری زندگی سے گویا شخصی Element، شخصی دلچسپی جتنی چیزیں ہیں وہ کم ہوگئیں اور زیادہ یہ شے بڑھ گئی کہ وہ تکنیک اور اس کا اسلوب، جیسا میں کہہ رہا تھا کہ، تمام قدیم و جدید زندہ و مردہ اسالیب کے تجربے اس میں میرے پچیس تیس سال لگ

گئے، لیکن شاید اب میں اس سے فائدہ اٹھا کر کوئی کام ایسا کرسکوں جس میں یہ۔۔۔(اظہار پاسکے)۔

انتظار حسین: اب تو صورت مجھے یہ نظر آ رہی ہے اس ساری گفتگو سے تمہاری کہ ایک تو یہ کہ اُردو شاعری کے جو اسالیب ہیں اُن سب پر تمہیں آشنائی اور پوری قدرت ہے، اُسے تم نے کھنگال کر دیکھ لیا اور اس کے بعد تم ایک ایسے تجربے سے گزرے ہو جس کی کہ جہت کچھ مابعدالطبیعیاتی ہے، جس قسم کے تجربے سے کوئی ایک صوفی گزر سکتا ہے وہ تجربہ تمہارے پاس ہے اور جو اسالیب ہیں اردو شاعری کے وہ تمہاری گرفت میں ہیں۔ اب تو یعنی مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ یعنی تم شاعری میں کوئی بڑا کام کرسکتے ہو!!

سلیم احمد: مجھے بھی امید یہی ہے کہ عسکری صاحب نے جو تیس سال مجھ کو ریاضت کروائی، شاید یہ وقت وہ ہے کہ اب اس کا کوئی ثمر مجھے حاصل ہو سکے، کیونکہ یہ بات میں نے گویا سیکھ لی تھی، انہوں نے کہا تھا کہ پہلا کام تو لفظوں کو جوڑنا ہے، یعنی اس کے جوڑنے کی جتنی قسمیں بھی ہو سکتی ہیں، اور ان کے سانچے بنانے ہیں۔ جب وہ بنا چکو تو پھر اُس میں اپنے تجربے کی روح بھرنی ہے تو گویا ایک فیز اس کا مکمل ہو چکا ہے۔ اب اگر میرے پاس کچھ زندگی باقی ہے تو میرے پاس ایسے تجربات ہیں اور ان کے اظہار کے ایسے سانچے ہیں کہ جو ہم عصر شاعری کے پاس نہیں ہیں۔ شاید میں وہ کام کرسکتا ہوں۔[۱۰]

انتظار حسین: اچھا تو اس وقت شاعری میں جو تجربے ہو رہے ہیں، کوئی نثری نظم ہے اور اس سے پہلے جو تجربے ہو چکے ہیں ان پر تو تم اظہارِ خیال کر ہی چکے ہو تو اس وقت جو شاعری ہو رہی ہے۔ ہماری غزل سے ہٹ کر اور غزل میں اس کے بارے میں تم مجھے بتاؤ بالخصوص یہ نثری نظم کا مسئلہ جو آج کل ہے۔

سلیم احمد: نثری نظم میں، مطلب یہ ہے کہ نثری نظم کا ابھی تک بطور ایک آرٹ فارم کے اس کا کوئی اصول یا اس کا کوئی وہ، یعنی یہ معلوم ہوا کہ اس میں کچھ تجربات کی تشکیل کی جا سکتی ہے، کچھ تجربات کا اظہار کیا جا سکتا ہے لیکن ان تجربات کی جمالیاتی قدر و قیمت کیا ہوگی، اس کا تعین جو ہے وہ بہت دشوار ہے اور میں نے گویا یہ محسوس کیا کہ جو نثری نظمیں لکھ رہے ہیں، جن کی چھپی ہیں اب تک اُن میں سب سے بہتر کشور[۱۱] نے لکھی ہیں اور کشور کی نظمیں مجھ کو بہت پسند آئیں اور ان کا Content بھی، اس کا Treatment بھی جو تھا وہ مجھ بہت کو زوردار لگا اور میں نے اس سے کہا بھی کہ صاحب میں نے یہ محسوس کیا (ہے) کہ تم نے سب سے بہتر نثری نظمیں لکھی ہیں۔ ایک بات، انتظار حسین، کہ غزل میں جو جذباتی شاعری ہوئی ہے اور فکشن میں جو جذباتی فکشن لکھا گیا ہے اس کی روایت ہمارے ہاں اتنی ضرور موجود ہے کہ جذباتی نثری نظم آسانی سے لکھی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر صرف جذباتی تجربات کا ہی اظہار مطلوب ہے تو اس کے لیے نثری نظم کی (پھر) کیا ضرورت ہے، یہ میں سوچتا ہوں۔

انتظار حسین: اب اس میں بھی یہ ہے نا کہ ایک تو ہوتا ہے جذبے کا اظہار اور ایک ہوتی ہے جذباتیت، تو ہمارے یہاں جو ایک چلی آ رہی ہے، روایت، وہ (یہ ہے کہ) جذباتیت کو ہم نے جذبے کے ساتھ کچھ گڈمڈ کر دیا ہے۔ کچھ یہ خرابی بھی چلی آ

رہی ہے، ہماری شاعری میں بھی اور ہمارے افسانے میں بھی۔ اور اب ایک دوسری بات: تم نے اپنی شاعری کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہے اور مختلف اسالیب اور زبان و بیان کو دیکھا ہے، نثر بھی تم نے دیکھی ہے تو یہ جو ایک عام تاثر ہے ایک سمجھدار آدمی کا اِس زمانے میں کہ، ہمارے یہاں زبان و بیان کے اعتبار سے نثر بھی زوال کر چکی ہے۔ اب وہ Richness نثر میں یعنی نظر نہیں آتی جو ہمارے یہاں نثر مختلف ادوار میں دکھا چکی ہے اور یہی شاعری کی صورت ہے کہ زبان و بیان وہاں بھی اپنا زوال کر رہے ہیں۔ تو یہ جو ہے نا صورتِ حال۔۔۔

سلیم احمد: اس میں انتظار میں یہ کہوں گا کہ جہاں تک نثر کا تعلق ہے، تو تمہارے افسانے مجھ کو اس بنا پر بہت اہم معلوم ہوئے۔ دوسرے لوگوں کے، یہاں تک (کہ) بیدی تک کے مقابلے تک کہ تم نے اردو نثر کے جتنے اسالیب کو آزمایا، اتنا کسی آدمی نے، اتنے مختلف اسالیب کو نہیں آزمایا۔ اور تم کو میں یہ بتاؤں کہ ریڈیو کی ملازمت میں، میں نے بھی نثر کے اتنے اسالیب آزمائے کہ شاید کسی فکشن رائٹر نے اتنے (نہ آزمائے ہوں) یعنی مختلف قسم کی نثریں، تجزیاتی نثروں اور عقلِ محض کی نثر سے لے کر جذباتی ترین نثر (کا) کوئی اسلوب ایسا نہیں تھا جس کی میں نے وہاں۔۔۔ (کوشش نہ کی ہو)۔

انتظار حسین: دیکھو تم نے ریڈیو کا حوالہ دے دیا ہے تو مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ ایک شاعر کی حیثیت سے اور ایک ادیب کی حیثیت سے تم شروع سے دشمنوں میں گھِرے ہوئے رہے ہو۔ ایک تو یہ مجرد تصورات حلقہ ڈالے رہے تمہارے۔ ایک یہ ریڈیو اور اس کے بعد ٹی وی۔ یہ تمہارے دو بہت بڑے دشمن مجھے نظر آتے ہیں کہ اس میں بھی جو یہ تمہارا تخلیقی جوہر ہے اس میں مجھے خاصا ضیاع ہوتا نظر آتا ہے۔ وہ تو ویسے تو ہم سب ہی یہ سارے کام کرتے ہیں۔ میں اخبار نویسی کرتا ہوں۔ ریڈیو کے لیے بھی لکھتا رہا ہوں لیکن جس طریقے سے یہ میڈیا جو ہے نا ریڈیو، ٹی وی اور پھر، پر یہ تعقل (وغیرہ) انہوں نے تمہیں ضرر (بہت) پہنچایا اور مجھے لگتا جتنے بھی لکھنے والے ہیں (انہیں) اس طریقے سے نہیں پہنچایا۔

سلیم احمد: ہا ہا ہا! یہ صحیح ہے۔ (سلیم احمد کا طویل بے ساختہ قہقہہ!)

انتظار حسین: تو تمہاری یہ دوستی جو ہے ریڈیو اور ٹی وی سے تمہیں پسند ہے؟ مجھے تو اخبار سے اپنی دوستی پسند نہیں ہے بالکل۔

سلیم احمد: ہاں ہاں ہاں! میں ان میں بہت Involve ہو جاتا ہوں، انتظار، جب میں لکھتا ہوں ریڈیو، ٹی وی کے لیے تو یہاں تک فلم کے لیے میں لکھتا تھا تو مجھ پر جنون طاری ہو جاتا تھا کہ مجھے اُس وقت کوئی چیز سوجھتی نہیں تھی بالکل۔ ایک طرح کی گویا میرے اندر یہ چیز ہے کہ، افراد کے ساتھ بھی رہی ہے اور ان چیزوں کے ساتھ بھی رہی ہے، ان اداروں کے ساتھ بھی کہ میں اُن کا وفادار بہت رہا ہوں۔

انتظار حسین: اچھا تمہارے برخلاف میں بہت بے وفائی کرتا ہوں یعنی میں اخبار میں ملازمت کرتا ہوں، اتنے عرصے سے اور میری کالم نگاری بھی داد وداد بھی لیتا رہا ہوں۔ لیکن میں نے اس کے لیے بالکل الگ خانہ لگا رکھا ہے کہ بھائی یہ میرا پیشہ ہے مجھے کالم لکھنا ہے اور اس کے بعد گھر آ کر دوسرا کام کرنا ہے۔ تم اس میں بالکل یعنی مبتلا ہو جاتے ہو اس کے اندر۔۔۔

سلیم احمد: (ہاں) مبتلا ہو جاتا ہوں اور دوسری بات یہ ہے کہ مبتلا ہونے کے باوجود تم یہ دیکھو کہ میں نے اپنے نثر میں اپنی تنقید میں، مطلب یہ کہ، اتنا تحفظ کیا کہ میں نے اُن کے اثرات آنے نہیں دیے۔

انتظار حسین: ہاں یہ صحیح ہے۔

سلیم احمد: ان کے اثرات سے میں محفوظ (رہا)۔ حالانکہ بڑے بڑے اس سے متاثر ہوجاتے ہیں اور جتنا Involvement میرا تھا اس میں یہ بہت خطرہ تھا کہ وہ چیزیں متاثر ہوجائیں گی۔

انتظار حسین: تم نے، یعنی جب میڈیا سے تمہارا تعلق اتنا گہرا ہے، تو ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ یعنی Series جو تم لکھتے رہے ہو نا، مختلف حوالوں سے، وہ تو الگ چیز ہے لیکن ڈرامہ بطور صنف کے اسے بھی اپنانے کی کوشش کی کبھی؟

سلیم احمد: ہاں! ڈرامہ مطلب یہ کہ میں نے ریڈیو پر، ٹی وی پر تو میں نے نہیں کیا، لیکن ریڈیو پر میں نے اسے بطور صنف کے آزمایا اور تقریباً ڈیڑھ سو ڈرامے میں نے لکھے، مختلف نوعیّتوں کے کچھ مشق کے، کچھ تجربات کے۔۔۔

انتظار حسین: اچھا ایک چیز یہ ہے کہ تم یہ بتا رہے ہو کہ ہم عصروں سے تو تمہارا وہ رشتہ نہیں رہا یعنی تم ایک ایسے شخص ہو کہ یا تو تمہارا کوئی بزرگ ہونا چاہیے یا تمہارا کوئی خرد ہونا چاہیے۔ برابر کا کوئی نہیں ہونا چاہیے۔ تو تم میں کچھ تو بزرگ تھے کہ، بھئی عسکری صاحب ہوگئے یا یہ کہ تمہیں اپنے نیچے ایک یعنی پورا ایک گروپ اور یعنی امت بنانے کا شوق ہے۔ یہ مجھے تمہارے ہاں بہت بڑا نظر آتا ہے۔ (قہقہہ بلند ہوتا ہے دونوں طرف سے۔ ہا ہا ہا ----- ہا ہا ہا -----) ہم عصروں سے کوئی رشتہ نہیں۔ یا تو استاد ہونا چاہیے یا تو شاگرد ہونا چاہیے۔

سلیم احمد: (قہقہہ بلند ہوتا ہے) ارے بالکل تم صحیح کہہ رہے ہو۔

انتظار حسین: تو امت کا تمہارا، اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ (دونوں طرف سے قہقہے بلند ہوتے ہیں۔ ہا ہا ہا۔۔۔!!)

سلیم احمد: بھائی میرے اندر ایک لیڈر تو ہے! بلکہ لیڈر تو میں تکلفاً کہہ رہا ہوں، ایک پیغمبر ہے میرے اندر، اور اس کی یعنی بعض اوقات بڑا وہ خشمناک ہوجاتا ہے۔ خشمنا کی اور یہ عناصر بھی اس میں پیدا ہوجاتے ہیں۔ تو وہ تو میرے اندر ہے اور وہ بچپن سے ہے۔ دیکھیں میں محسوس کرتا ہوں کہ شاید میرا اصل رول جو تھا وہ مذہبی اور سیاسی ہی تھا یعنی ایک بڑے معنوں میں۔ یعنی ایک ایسے معنوں میں کہ جو انسانی تقدیر پر یا قوموں کی تقدیر پر تفسر بھی کرتا ہو، تعقل بھی کرتا ہو اور اس کے گویا اس کی تقدیر کے مسائل سے بھی (تعرض کرتا ہو)۔ اور یہ شعر و ادب کا کام گویا۔۔۔ میں کہتا ہوں بھائی چھوٹا چھوٹا چڑیا جو ہے چی، چی، چی، چی کر رہا ہے یا غزل لکھ لی ہے تو کہہ رہا ہے بس میں کائنات کا سب سے بڑا آدمی ہوگیا۔ تو یہ میرا اندر سے رویہ ہے۔

انتظار حسین: اچھا ایک تمہارا دوسرا بھی ہوسکتا تھا اس کے ساتھ ساتھ جب تمہارے اردگرد لکھنے والوں کو دیکھتا ہوں جو کہ

ابھی ابتدائی منزلوں میں ہیں یا جو تم سے بہت عقیدت رکھتے ہیں کہ جو ہمارے ادب میں میرا جی کا رول رہا ہے کہ ایک ایسی فضا پیدا کرنا اور جو نئے ذہن اٹھ رہے ہیں۔ان کی تربیت کو وہ آگے چل کر کچھ بنیں تو میرا جی تو اپنے اس رول میں کامیاب رہے ہیں۔تو لیکن مجھے ابھی تک تم اپنے اس رول میں کچھ زیادہ۔۔۔

سلیم احمد: نہیں، وہ رول ہی میرا نہیں ہے۔میرا جی تو ادیب پیدا کرنا چاہتے تھے۔میرے پاس ادیب آتا ہے ادب چھوڑ دیتا ہے، پھر وہ ان مسائل میں لگ جاتا ہے۔اگر لگ گیا تو یا تو وہ ہو جاتا ہے معطل، ذہنی طور پر جو ہے وہ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے پھر وہ جو میں کہتا ہوں، وہ کرنے لگتا ہے اور اگر وہ ہوتا ہے تو پھر وہ اس کے اندر یہ تحقیر پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ تو کام ہی کوئی نہیں ہے۔ان (میرا جی) کا کام تو ادیب پیدا کرنا تھا۔یہ فرق ہے۔

انتظار حسین: اچھا صاحب! کتنا ہو گیا معاملہ؟ اب میرے ذہن میں کوئی سوال نہیں آ رہا اس وقت۔(انتظار حسین ہنستے ہیں!!)

حواشی از مرتب

۱۔ میرٹھ میں کالج کا نام فیض عام کالج، میرٹھ

۲۔ یہاں سلیم احمد جس نظریاتی زندگی کی بات کر رہے ہیں اسے فراق کی ترقی پسندی اور عسکری کے تہذیبی و ادبی تصورات کے پس منظر میں دیکھا جائے۔سلیم احمد اس معاملے میں فراق کے بجائے عسکری کے ساتھ رہے۔

۳۔ یہ سب باتیں عسکری نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے جزیرے کے ''اختتامیہ'' میں لکھی ہیں جو آج تک فکشن کی تنقید کا ایک عمدہ نمونہ شمار ہوتا ہے۔

۴۔ اس سوال میں انتظار حسین سلیم احمد کی شاعری کی جمالیاتی جہت، خارجی ہیئت اور موضوعاتی سطح میں بنیادی عناصر کو گرفت میں لا رہے ہیں۔

۵۔ یعنی عسکری کے بتائے طریقے پر چلنے سے جب انکار کیا۔

۶۔ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ ۷۰ کی دہائی میں سلیم احمد بعض معاملات میں جماعتِ اسلامی کے قریب ہو گئے تھے جبکہ عسکری ذوالفقار علی بھٹو کے شیدائی تھے۔

۷۔ نہیں، ہمارے علم کی حد تک انتظار حسین کا یہ تاثر کلیتاً درست نہیں۔سلیم احمد کا تصورِ اسلام عسکری والی ہی تھا، مودودی صاحب والا بالکل نہیں تھا۔سیاسی لائحہ عمل کے طور پر سلیم احمد جماعتِ اسلامی کی طرف ضرور گئے تھے مگر ان کا فہمِ اسلام جماعتِ اسلامی اور مودودی صاحب سے مختلف ہی رہا۔تفصیل پھر کسی موقع پر!!

۸۔ یہاں سلیم احمد نے لفظ ''نئے تصوف'' شاید سہواً کہا کیونکہ انتظار حسین کے ہاں نیا پرانا کوئی تصوف کم از کم مجھے نظر نہیں

آتا۔امکاناً یہاں سلیم احمد ''نئے تصور'' کہنا چاہتے تھے شاید!! ویسے بھی کسی ''نئے تصوف'' سے سلیم احمد کبھی متفق ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

۹۔ اشارہ ہے سلیم احمد کے بعداز مرگ شائع ہونے والے شعری مجموعے مشــــــرق کی طرف جو۱۹۸۹ء میں مکتبہ نیا ادب، کراچی سے شائع ہوا۔

۱۰۔ افسوس کہ آخری عمر میں جس طرح عسکری صاحب ادب کی طرف پلٹ کر تصورِ روایت سے حاصل ہونے والے تجربات کی روشنی میں کچھ کام کرنا چاہتے تھے مگر مہلتِ حیات ختم ہوگئی، اس طرح سلیم احمد بھی اس گفتگو کے دو اڑھائی مہینے بعد ہی انتقال کر گئے تھے۔

۱۱۔ مراد کشور ناہید ہیں۔